Fikr-o-Nasar (Islamabad) 7:12 (1970)

اقبال کا نظریۂ اجتہاد

ڈاکٹر محمد صغیر حسن معصومی

(ڈاکٹر صاحب نے یہ مقالہ پشاور یونیورسٹی شعبہ اردو کی طرف سے ۲۷ اپریل سنہ ۷۰ء کو منعقد ہونیوالے یوم اقبال پر سنایا)

علامہ اقبال کی نظر میں کائنات مسلسل تغیرات و انقلابات کی آماجگاہ ہے۔ اور ان تغیرات کی تہ میں خالق فطرت کے اٹل اصول کارفرما ہیں جن سے قوموں کا عروج و زوال وابستہ ہے، اقوام عالم کی تاریخ میں اسلام نے اولین بار اپنے اصولوں کی ہمہ گیری اور تکمیل کا دعوےٰ کیا اور نہایت قلیل مدت میں چار دانگ عالم سے اپنی برتری کا لوہا منوالیا۔ پیروانِ اسلام کا شمار تقریباً بارہ صدیوں تک روئے زمین کی ترقی یافتہ مہذب ترین اقوام میں ہوتا رہا۔ سترہویں صدی مسیحی کے اواخر سے یورپین اقوام کی جد و جہد سے گوناگوں انقلاب و تغیرات رونما ہوئے۔ صنعت و حرفت کے میدان میں گیس اور بجلی کی دریافت سے دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی اور تجارت و کاروبار کے نئے نئے اصول وضع ہونے لگے۔ بین الاقوامی تعلقات کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ مسابقت اور استحصال کے نئے نئے منصوبے بھی رونما ہونے لگے۔ ان یورپین اقوام کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے چودہ صدیوں پرانے اور فرسودہ آلات رکھنے والے ایمان و عمل کے کمزور مسلمان سارے عالم میں بے بس ہو کر رہ گئے۔ زمان و مکان کے تغیر سے پیدا ہونے والی مختلف رسم و رواج کی پابندیوں اور جغرافیائی ماحول کی تبدیلیوں سے بتدریج ان کی صلاحیتوں میں اس قدر اضمحلال پیدا ہو گیا کہ وہ تازہ دم اقوام مغرب کے حملوں کی تاب مقاومت نہ لاسکے اور مسلسل پستی کی طرف جانے لگے۔ چنانچہ علماؤ حکمائے امت کی رگ حمیت پھڑکی اور ہر ایک نے اپنی بساط بھر عظمتِ رفتہ کی بازآوری کی کوششیں شروع کر دیں تاکہ کسی صورت سے اس مردہ قوم میں حیاتِ نو پیدا کریں۔ مصلحین کی یہ کوششیں بحمداللہ بارآور ہوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے امتِ مرحوم میں حیات کے آثار ظاہر ہونے لگے۔

حکیم الامت ڈاکٹر محمد اقبال ؒ اپنی نظموں اور تقریروں سے مسلمانانِ عالم کو بیدار کرنے لگے۔ اسی زمانے میں اسلامی اصولِ زندگی کی طرف ان کی توجہ منعطف ہوئی۔ انہوں نے پوری توجہ سے مسلمانان عالم کے اسباب تنزل کا تجزیہ کیا اور ان کے قول و فعل کے تضاد کو دیکھتے ہوئے پکار اٹھے۔

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟ — خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟
عبث ہے شکوہ تقدیر یزداں — تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے؟

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

ان کی تشخیص کے مطابق مسلمانوں کی موجودہ پستی و بدحالی کی وجہ تعلیمات اسلام کی پابندی نہیں بلکہ پیروانِ اسلام کے طرزِ عمل کی تبدیلی اور روحِ اسلام سے غفلت ہے جس نے مسلمانوں کا شیرازہ ابتر کرکے رفتہ رفتہ انہیں راکھ کا ڈھیر بنا دیا ہے اب مسلمانوں کی موجودہ حالت باعث حیرت و استعجاب نہیں بلکہ ان کا باقی رہ جانا اور آج تک اپنی خاکستر میں چنگاریوں کو دبائے رکھنا بجائے خود ایک معجزہ اور اسلام کی عظمت و برکت کی دلیل ہے۔

اسلام نے جس سیاسی و اجتماعی انقلاب کی دعوت دی تھی اس کی بنیاد توحید پر قائم ہے۔ یعنی معبود کی وحدانیت کے ساتھ ساتھ بندوں کی وحدانیت پر بھی نظر رکھنا ضروری ہے اور بندوں کی وحدانیت کی وجہ سے ہر فرد اللہ کے سامنے جوابدہ اور بلا امتیاز رنگ و نسل مساویانہ عبدیت کا مالک ہے۔ اور سارے افراد صرف ایک اللہ کے بندے بن کر آپس میں بھائی بھائی بن جاتے ہیں وہ حلقۂ اسلام میں داخل ہونے کے بعد انانیت اور خود پسندی کو اپنے لئے طرۂ امتیاز نہیں سمجھتے بلکہ اپنی انفرادی جد وجہد کو ساری انسانیت کی ترقی و فلاح کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات میں یہی صحیح پیہم اور مسلسل جد وجہد اسلامی طرزِ حیات کا محور ہے۔ یہ جذبہ حضرت پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے معین حیات ہر مسلمان میں بدرجہ اتم کارفرما رہا اور اسلامی معاشرہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔

علامہ اقبال کی نظر میں گذشتہ پانچ صدیوں سے مسلمان اسی جذبہ سے محرومی کے باعث جمود و خمود میں مبتلا ہو گئے۔ اگر انہیں اللہ کا وہ راستہ معلوم کرنا ہے جو انسانیت کی فلاح و بقا کا ضامن ہے تو انہیں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اپنے سامنے رکھنا ہوگا۔ الَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ (۲۹ : ۶۹) جو لوگ ہماری خاطر کوشش کرتے ہیں ہم انہیں اپنی راہ ضرور دکھاتے ہیں۔ اللہ ضرور نیک کام کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

علامہ اقبال کی نظر میں یہ آیت کریمہ مسلمانوں کو اجتہاد کی پرزور تلقین کر رہی ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضؓ فرماتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ سب سے افضل جہاد کون سا ہے؟ آپؐ نے فرمایا، کلمۃ عدل عند سلطان جائر۔ کسی ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کا کلمہ کہنا۔ اس پر ابوسعید کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یوں تو مجاہدہ کے لغوی معنی کوشش کرنے کے ہیں مگر اس کی کوشش میں ورع، تقویٰ، زہد صبر و شکر، توکل و تواضع کا مفہوم ہمیشہ کارفرما ہوتا ہے اور اعتصام بحبل اللہ کا خارجی مظاہرہ

خود سیرت پاک پر نظر رکھنے والے واقف ہیں کہ مکی زندگی میں اس اجتہاد کی منزل کچھ اور تھی اور ہجرت کے بعد کی حیات طیبہ کے سیاسی اور اجتماعی تقاضے کچھ اور تھے۔ فتوحات کے اضافے کے ساتھ ان تقاضوں کی شدت بڑھتی گئی اور ان کی نوعیت کچھ اور ہو گئی۔

صحابۂ کرام کی تربیت کاشانۂ نبوت کی زیر نگرانی ہر ہر منزل پر ہوئی۔ قرآنی احکام کی تفصیلات کے علاوہ حیاتِ مکہ کے جزئی واقعات، تبلیغی کارنامے، شعب ابی طالب کا آزمائشی دور، صحابۂ کرام کو ہجرت حبشہ کی اجازت دینا، ایام حج میں غیر کی وفود سے ملنا اور انہیں اسلام کی تلقین کرنا، مختلف معاہدے، ہجرتِ مدینہ کے جزئی واقعات سب کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہاد و تفقہ، حزم و احتیاط، سیاسی و تبلیغی دوراندیشیوں پر شاہد عدل ہیں۔ مدینہ طیبہ پہنچ کر انصار و مہاجرین میں مواخاۃ قائم کرنا، یہودیوں، عیسائیوں اور غیر مسلم قبائل سے معاہدے کرنا اور ساتھ ہی مختلف غزوات، صلح حدیبیہ نیز وقتاً فوقتاً فوجی گشتی دستے (سرایا) بھیجنا اور دوسرے سارے سیاسی و مذہبی معاملات سب کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہاد و تفقہ پر دال ہیں۔

دوسری تیسری صدی ہجری سے فقہاء و محدثین کے کارنامے جو کچھ آج تک ظہور پذیر ہوئے ان کی روشنی میں یہ کہنا حقیقت سے دور نہیں معلوم ہوتا کہ فقہاء و مجتہدین نے خواہ وہ عرب ہوں یا عجم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے قانونِ اسلام کی تدوین میں بڑی محنت و جانفشانی سے کام لے کر اپنے فرائض انجام دیئے۔

خود قرآن پاک سے بہت سے شخصی اور اجتماعی احکام پر عبادات کی تفصیلات کے علاوہ بڑی حد تک روشنی پڑتی ہے۔ اور ان احکام و اوامر و نواہی کی وضاحت ہو جاتی ہے جن کی تدوین بعد میں اصول فقہ کے ماتحت کی گئی۔

علوم کے ارتقاء و انضباط کی رو سے یہ صحیح ہے کہ علوم فقہ و اصول، اصول تفسیر و اصول حدیث وغیرہ بتدریج دوسری تیسری صدیوں سے جمع و ترتیب سے آراستہ ہونے لگیں۔ مگر سچ پوچھئے تو اکثر بنیادی اصول خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ حیات متمیز طور پر متداول ہو چکے تھے۔ اوّلہ اربعہ یعنی قرآن، حدیث یا سنت رسول اللہ، اجماع اور قیاس کی حجیت پر قرآنی آیات، احادیث رسول اور آثار صحابہ میں واضح دلائل موجود ہیں، یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا۔ (۴: ۵۹) اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اولی الامر کی فرمانبرداری کرو، پس اگر کسی چیز میں تم میں تنازعہ ہو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف رد کرو۔ اگر تم اللہ اور آخری دن یعنی قیامت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی بہتر اور انجام کے لحاظ سے حسین تر ہے۔

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ: اور تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم ایمان والے ہو"

ان آیات سے ظاہر ہے کہ اسلام اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کا حکم دیتا ہے۔ اور اطاعت کو فرض قرار دیتا ہے کیونکہ قرآن پاک میں جہاں کہیں امر کا صیغہ استعمال ہوا ہے اور اس کے بعد حرفِ شرط استعمال کیا گیا ہے وجوب و فرضیت

ظاہر کرنا مقصود ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالےٰ کی اطاعت عین رسول کی اطاعت قرار دی گئی ہے جس کا مطلب واضح ہے۔ قرآن حکیم کے احکام و فرائض کی تشریح خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔ اور قرآنی احکام کو ان کے مطابق عمل کر کے بتایا کرتے تھے۔ عملی طور پر رسولؐ کے اعمال و افعال یعنی سنن و اقوال نسلاً بعد نسلٍ ہم لوگوں تک عمل اور کتابت دونوں طریقوں سے اسی طرح پہنچے ہیں جس طرح خود قرآن پاک حفظ و کتابت کے ذریعے ہمارے ہاتھوں تک پہنچا ہے۔ وضو کے طریقے، نماز روزے کے طریقے، حج اور دوسرے احکام کے طریقے سب حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے اور عمل کئے ہوئے طریقے ہیں جو صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین اور ہمارے دوسرے اسلاف کے ذریعے ہم لوگوں تک پہنچے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا اسلام نے اطاعت کو فرض قرار دیا ہے۔ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ حکم کی موافقت کو اطاعت کہتے ہیں، اور سورۂ نساء کی آیت اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کے ساتھ ان کنتم تومنون باللہ والیوم الآخر کی شرط موجود ہے جس سے اللہ اور رسول نیز الامر منکم کی اطاعت کی فرضیت ظاہر ہے جس کے معنے یہ ہوئے کہ قرآن سنت نبوی اور اولی الامر منکم یعنی اجماع کی اطاعت بھی فرض ہے۔ ساتھ ہی یہ حکم دیا گیا ہے کہ کسی امر میں تنازع کی صورت میں قرآن و سنت کے دوسرے بتائے ہوئے احکام کے ساتھ مقابلہ کر کے ان احکام کی روشنی میں اس تنازعہ کو دور کرنا ضروری ہے جو ظاہر ہے قیاس کی شکل ہے۔

اس آیت پاک میں اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت کے ساتھ اولی الامر منکم کی اطاعت کا حکم بھی صادر ہوا ہے علماء امامیہ اولی الامر منکم کے لئے عصمت کی شرط لگاتے ہیں اور اس لئے اہل بیت مراد لیتے ہیں بظاہر منکم سے نہ اہل بیت کی تفسیر معلوم ہوتی ہے اور نہ عصمت کا مفہوم واضح ہوتا ہے۔ بلکہ عام اہل اسلام کا مفہوم واضح اور ظاہر ہے۔ صحابہ کرام کیلئے تو اللہ کا قول "رضوان اللہ علیہم" ان کی مغفرت کی دلیل ہے۔ مگر صحابہ کے بعد کسی ولی اللہ کے لئے بھی یہ حکم یقینی نہیں، پھر اطاعت کا یہ حکم عام ہے اور ہر زمانے کے لئے ہے۔ ساتھ ہی اولی الامر سے مراد ایک شخص یا فرد نہیں ہو سکتا، لامحالہ اولی الامر سے مراد ہم ہر زمانے کے ایماندار اور دیانت دار ارباب حل و عقد ہی کو لے سکتے ہیں جو امت کی خیر و بہبودی کا خیال رکھتے ہیں اور سارے امور کو انجام دیتے ہیں۔ ایسے ارباب حل و عقد کا آپس میں کسی امر میں متفق ہونا ضروری ہے۔ اس لئے اس قرآنی اصطلاح 'اولی الامر' سے اجماع امت مراد ہے۔ آیت کا بقیہ حصہ یعنی فان تنازعتم فی شئ فردوہ الی اللہ و رسول، اس بات کو واضح کرتا ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں قرآن و حدیث سے کوئی حکم مستفاد نہ ہو تو اس مسئلہ کے مثل کسی ایسے مسئلہ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے جس کا حکم قرآن یا حدیث میں موجود ہے یا اجماع امت سے اس کا حکم پایۂ ثبوت کو پہنچا

ہے اور اسی کو قیاس یا انالوجی کہتے ہیں۔ غرض اس آیت پاک سے اصول فقہ کے ادلّہ اربعہ اور اجتہاد کے مأخذ کتاب، سنت، اجماع اور قیاس واضح طور پر مستنبط ہیں۔ آیت پاک کی ترتیب کے مطابق ان چاروں اصولوں کو اسی ترتیب کی رعایت کے ساتھ سمجھنا چاہیئے۔ غرض قیاس و اجماع کو قرآن و سنت پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ نیز آیت پاک فان تنازعتم فی شئ فردوہ الی اللہ والرسول، اس بات کی ہدایت کرتی ہے کہ قیاس اسی وقت عمل میں لایا جائے جبکہ کتاب، سنت اور اجماع سے مسئلہ کے حکم پر روشنی نہ پڑتی ہو۔

ان اصول اربعہ کی حجیّت اور ان کی ترتیب کی رعایت کی مزید توثیق حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت سے ہوتی ہے جس کو خود علامہ اقبال نے اپنے لکچر میں بیان کیا ہے۔ جب حضرت معاذ ارشاد نبوی کے مطابق یمن کی قضا پر جانے لگے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور امتحان پوچھا۔

"جب کوئی مقدمہ درپیش ہو تو کس طرح فیصلہ کروگے"؟ حضرت معاذ نے جواب دیا۔ "اللہ کی کتاب کے موافق فیصلہ کرونگا" ارشاد ہوا۔ اگر کتاب اللہ میں موجود نہ ہو تو کیا کروگے؟" آپ نے جواب دیا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا۔" حضور نے دوبارہ فرمایا۔" اگر کوئی حکم سنت رسول میں بھی موجود نہ ہو تو" آپ نے جواب دیا" میں اپنی رائے قائم کرنے کی کوشش کروں گا اور اس میں کوتاہی نہ کروں گا۔"

غرض حضرت معاذ نے قیاس کو آخری درجہ دیا اور حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریر و تثبیت کی اور انکار نہ کیا یہاں اس نکتے کی وضاحت خالی از فائدہ نہیں کہ ابلیس کے لعنتی ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے نص قرآنی کے مقابلہ میں قیاس کو ترجیح دی اور اللہ تعالےٰ کے حکم "فاسجدوا لآدم" کی اطاعت میں آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ چونکہ ابلیس ملائکہ کے ساتھ رہتا تھا۔ اور بروایتے ان کا معلّم بنا ہوا تھا۔ اس لئے ملائکہ میں داخل تھا۔ لیکن اپنی عقل سے اس نے خود کو ملائکہ سے خارج قرار دیا، اور کبر و غرور سے کام لیا۔ چنانچہ جب سجدہ نہ کرنے پر باز پرس کی گئی تو اس نے یہ حجت پیش کی کہ خلقتنی من نار وخلقتہ من طین، یعنی اپنے زعم میں نار کو طین سے لطیف تر ہونے کی بنا پر بہتر قرار دیا اور یہ بھول گیا کہ عنصر ہونے میں نار و طین دونوں برابر ہیں۔ غرض ندامت و پشیمانی کے اظہار کی جگہ اپنی نافرمانی پر اڑا رہا۔ اور حکم خداوندی کو اپنے قیاس سے ٹالنا چاہا۔ فبھت الذی کفر،

قرآن حکیم کے بعد سنت کا مرتبہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں کم و بیش عملی طور پر متواتر چلی آرہی ہیں اور ان کی تفصیل قولی اور فعلی احادیث و مرویات میں منضبط ہیں، احادیث کو پرکھنے کی غرض سے یہ روایت بیان کی جاتی ہے جس کے مضمون کو قبول کرنے میں احتیاط و حزم کو دخل ہے۔ یعنی جب کوئی حدیث میری نسبت سے بیان کی جائے تو اس کا مقابلہ کتاب اللہ سے کرو۔

اگر قرآن کے حکم کے مطابق ہو تو قبول کرو ورنہ اسے چھوڑ دو۔

سنت کے بعد اجماع اور پھر قیاس کی باری ہے۔ دوسری دلیلیں مثلاً استصلاح اور استحسان جو بیان کی جاتی ہیں۔ وہ درحقیقت قیاس ہی کی فروع ہیں۔ اور اس لئے کوئی پانچویں دلیل یا حجت نہیں ہو سکتی۔ یہ بات خود آیت مذکورہ سے واضح ہے اس لئے کہ صورتیں دو ہی بیان کی گئی ہیں۔ ایک وہ جس کے بارے میں حکم مذکور ہے جو قرآن اور حدیث پر مشتمل ہے اور دوسری وہ صورت جس کے متعلق کوئی حکم بیان نہیں کیا گیا ہے اس صورت میں یا اجماع کا ظہور ہوگا یا انفرادی قیاس کا، اس آیت میں کسی پانچویں چیز کی طرف اشارہ نہیں ملتا۔

قرآن حکیم کی تعلیم کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حکمتیں اپنے فیصلوں، حکموں اور معاملات و عبادات کی تفصیلات کی شکل میں امت کو سکھائیں ان کی روشنی میں مثبت اقدامات سے دنیا و آخرت ہر دو عالم میں ہم امتیازی شان و سرفرازی حاصل کر سکتے ہیں کیونکہ ان تعلیمات پر عمل کر کے ہم اخلاق فاضلہ کے حامل ہو سکتے ہیں اور امن و امان، عدل و مساوات کے تحفظ کے لئے بہتر سے بہتر قوانین وضع کر سکتے ہیں کیوں کہ ان کے اصول قرآنی آیات اور سنت نبویہ نیز اقوال نبویہ میں محکم طور پر ثابت ہیں۔ انفرادی معاملات و مقدمات کے لئے فروعی اور انفرادی تفصیلی احکام کا استنباط نہایت آسان و سہل ہے جزوی احکام کے اختیار کرنے میں البتہ شخصی آراء و علم و فہم نیز مقامی عادات و رسوم کا اثر پڑنا لابدی ہے جس کا اعتراف ناگزیر ہے۔

آج یہ کہا جاتا ہے کہ فقہ کے اصول و قوانین دوسری تیسری صدی ہجری میں وضع ہوئے اور مدون کئے گئے۔ لیکن یہ تاریخی حقیقت ہے کہ احکام اسلام کے ماخذ کی تشریح کے ساتھ ساتھ اصول احکام بھی خود شارع علیہ السلام اور قرآن پاک کے الفاظ میں لوگوں میں متداول ہوئے اور وضاحت کے ساتھ سمجھے گئے۔ اور حضرت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے انہیں سمجھا، اور ان پر عمل کیا۔ چنانچہ فرضیت و وجوب، حلال و حرام، استحباب و کراہت، اباحت و سنت کے الفاظ خود قرآن پاک اور اقوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ماخوذ ہیں۔ فرض احکام کی دونوں قسمیں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل سے ثابت ہیں۔ چنانچہ صلوٰۃ کی فرضیت تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ظاہر ہے۔ مگر صلوٰۃ جنازہ کا فرض کفایہ ہونا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے ثابت ہے اور اس طرح فرض عین اور فرض کفایہ کی اصطلاحیں بھی آپ ہی کے عہد میں وضع ہوئیں۔ حضرت سعید بن المسیبؒ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطابؓ مدینے تشریف لائے تو آپ نے خطبہ دیا۔ (یہ ان کی خلافت کے زمانے کی بات ہے) یا ایھا الناس انہ سنت لکم السنن و فرضت لکم الفرائض، و ترکتم علی الواضحۃ الا ان تضلوا بالناس یمینا و شمالا، اے لوگو! تمہارے لئے سنتوں کو بیان کر دیا گیا ہے اور فرائض مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ اور تم ایک کھلے راستے پر چھوڑ دیئے گئے ہو۔ تو تم کسی طرح راستے سے بھٹک نہیں سکتے مگر یہ کہ تم خود لوگوں کے ساتھ دائیں یا بائیں مڑ جاؤ اور صراط مستقیم کو گم کر دو۔

بعض حضرات کی طبعی براقی کبھی یہ الاپنے لگتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے قرآن کے خلاف عمل کیا اور انہوں نے تالیفِ قلب کے لئے صدقات کا مال دینے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ قرآن پاک کی آیت بالکل واضح ہے کہ صدقات کی مد سے آٹھ قسم کے لوگوں میں سے جس کو چاہیں دے سکتے ہیں۔ یہ ہرگز قرآن کا منشا نہیں کہ ہر ایک کو بلا استثناء دیں اور اس لئے حضرت عمرؓ نے ہرگز قرآن کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی۔ اور یہ پالیسی تو درحقیقت حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اختیار کی تھی، حضرت عمرؓ نے اتفاق کیا اور جاری رکھا اس وقت چونکہ چاروں طرف اسلام کے نام لیوا روز بروز تعداد میں بڑھتے جا رہے تھے، انہوں نے نئے اسلام قبول کرنے والوں کو روپے اور مال کا لالچ دے کر اسلام کی رغبت دلانے یا اس پر قائم رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی، اور دوسرے سارے صحابہ کرام نے ان کی اس پالیسی سے اتفاق کیا۔

یہ حقیقت ہے کہ صحابہ کرام نے قرآن پاک کے احکام سمجھنے میں یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں اور حکموں کے سمجھنے میں کسی افتراق و تشتت کا اظہار نہیں کیا، اور آج ہمارے لئے ضروری ہے کہ ان سارے احکام میں اور اسلامی و قرآنی تعلیمات کے سمجھنے میں سرمو صحابہ کرام کے فیصلوں اور حکموں سے تجاوز نہ کریں تاکہ ہم لوگ اطاعت اللہ، اطاعت رسول اور اطاعتِ اجماع کے احاطے سے باہر نہ جائیں۔ فقہا کے کارنامے درحقیقت مقدمات و مسائل کے وہ فیصلے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں نیز حضرات صحابہ کے زمانے میں معرض وجود میں آئے۔ گویا فقہا کی کتابیں درحقیقت مقدمات و نظائر کا مجموعہ ہیں جن سے ہم اپنے زمانے کے مسائل حل کر سکتے ہیں اور قوانین اسلام دفعہ وار مرتب کر سکتے ہیں؛ ان وفاتر کی قیمت اس لئے نہیں کہ یہ فقہاء کرام کی رائیں ہیں، بلکہ ان کی قیمت اس طرح دوچند ہو جاتی ہے کہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کے مطابق ہمیں اپنی زندگی سنوارنے میں ان سے بے حد مدد مل سکتی ہے۔

فرائض خمسہ میں زکات کی سماجی اہمیت کے پیشِ نظر یہ عرض کرنا پڑتا ہے کہ زکات کے نظام سے غفلت برتنے کی وجہ سے اقتصادی بدحالی کے شکار لوگوں کی آج امت میں بہت زیادہ کثرت ہو گئی ہے۔ بایں ہمہ ملک کے ارباب حل و عقد بجائے اس کے کہ قرآن پاک کے بیان کردہ لوگوں کی امداد کرتے اور ان کی بدحالی دور کرنے کے منصوبے بناتے زکات کو ٹیکس کہہ کر اور کبھی اس کے نصاب میں اضافے کی سفارش کر کے حکومت کی آمدنی کا حصہ بنانا چاہتے ہیں اور یتیم و مسکین، بیواؤں، ناداروں کے حقوق کو اوقاف کی رقوم کے غلط استعمال کی طرح ہڑپ کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اسلامی حکومت کی تقویت اور خوشحالی یا ملکی تحفظ و دفاع کے لئے قرآن پاک نے صدقات نافلہ کی ادائیگی کا حکم دیا ہے، انفاق کی تلقین کی ہے اور انفاق کے لئے عفو یعنی مال زائد از حاجت کی وضاحت کر دی ہے بنود شارع علیہ السلام اور صحابہ کرام نے غزوات، قحط نیز عسرت و بدحالی کے اوقات میں انفاق و ایثار کی مثالوں سے واضح کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں اس کے دین اور

اس کے بندوں کی خدمت و محافظت میں کس طرح خرچ کرنا چاہیئے۔ یہ حقیقت ہے کہ نازک وقتوں میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کبھی اپنے بیان کردہ نصاب زکات میں اضافہ کرنے کی ضرورت محسوس کی اور نہ ایام خلافت میں یہ خیال پیدا ہوا۔ اور نہ ہی کبھی زکات کی رقم کو دفاع اور ملکی ضرورتوں کے لیئے خرچ کیا گیا۔ زکات کی رقم ہمیشہ معاشرہ کے ان افراد کی مالی اعانت میں صرف کی گئی جو اقتصادی بدحالی کا شکار رہے اور زکات ادا کرنے والے لازمین، یتیم، غریب نادار مسافروں کے لیئے اور فقر و فاقہ دور کرنے اور محتاجوں کی ضرورتوں کے لئے مخصوص رکھی گئی۔ اہل اسلام نازک اوقات میں ہمیشہ صدقہ و خیرات اور حسب حاجت وانفاق فی سبیل اللہ پر عمل پیرا رہے۔

اسلام کے یہ تفصیلی احکام جو عدل و مساوات اور دینی اخوت و معاونت پر مبنی ہیں صرف نظریئے نہیں بلکہ عمل کے اور برتنے کے لئے ہیں۔ آج حکیم الامت اقبال مرحوم کی دعوتِ عمل کے مطابق ان احکام کے نفاذ کی ضرورت ہے۔ قرآن حکیم کا بار بار ایمان کے ساتھ عمل صالح کا اعادہ کرنا خود اس بات کے لئے بیّن ثبوت ہے۔ کہ ایمان کا اظہار عمل صالح ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ اور ولی اعتقاد یا باطنی ایمان جس کا اظہار عمل صالح سے نہ کیا جائے کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت و رہنمائی، خلفاء راشدہ کی قیادت و خلافت، پھر ایام خلافت کی بوقلمونی، قرونِ اولیٰ میں امامت و امارت کی کش مکش اور اپنی اپنی سیادت کے لئے تگ و دو یہ ساری تاریخی حقیقتیں ہمیں سبق دیتی ہیں کہ جب تک فرزندانِ اسلام میں خلوص و کمال ایمان کے ساتھ ساتھ ایثار و قربانی کا جذبہ رہا ان کا علَم سربلند رہا اور نفسانیت و خود غرضی کے غلبہ کے ساتھ ساتھ گردش زمانہ کی نکبتیں ہمارے ایمان کا امتحان لیتی رہیں۔ چنانچہ شہادت حضرت عثمانؓ، واقعۂ کربلا، بنو امیہ، بنو عباس اور دوسرے خاندانوں کا عروج و زوال امت مسلمہ کا زوال نہیں۔ یہ تو درحقیقت تنبیہیں تھیں اور تازیانے تھے تاکہ فرزندانِ اسلام آئندہ حزم و احتیاط سے کام لیں۔ بغداد کی تباہی اور صلیبی جنگیں حقیقت میں آتشیں بھٹیاں تھیں جن میں تپا کر مسلمانوں کی تطہیر

آج بھی اسرائیلیوں کا تسلط اور جبر و استبداد بیسویں صدی میں اقوام مسلمہ کی تطہیر و تزکیہ کا آغاز ہے یہ درحقیقت بجلی کا کڑکا اور صوت ہادی ہے کہ اغیار کی امداد پر بھروسہ کرنا ہماری نادانی ہے۔ اس امداد سے اب بھی فائدہ اٹھانے کا تہیہ ہونا چاہیئے۔ اور علم و عمل، حرب و فن نیز صنعت و حرفت میں خود کفیل بننے کی کوشش پیہم ہونی چاہیئے اور جب تک جد و جہد اور جہاد فی سبیل اللہ ہم سبھوں کا لائحہ عمل نہیں ہوتا ہماری شکست و ریخت فتح و ظفر میں متبدل نہیں ہو سکتی۔ لادینی اشتراک عمل نکبت و خواری سے بچا نہیں سکتا۔ آج [illegible] کی کرنیں نمودار ہو سکتی ہیں تو صرف اسلامی اشتراک عمل اور اسلامی عمل صالح سے!

تاریخی واقعات، پرانی تہذیب وثقافت اور قدیم زمانے کی یادگاریں فخر ومباہات کے لئے نہیں ہیں۔ ان سے تو ہمیں یہ سبق حاصل کرنا ہے کہ ان کی روشنی میں ہم اپنے کردار کا جائزہ لیں۔ اور لوگوں کی خطاؤں اور لغزشوں سے بچنے کی سعی کریں تاکہ ہمیں وہ نتائج نہ بھگتنا پڑیں۔ جن کی پیش رفتہ قومیں بھینٹ چڑھ چکیں۔

پیغمبر اسلام علیہ صلوٰۃ وسلام اور صحابہ کرام کے حالات مظہر ہیں کہ عبادات ہی دین نہیں، بلکہ ان کے صحیح طور پر قائم کرنے اور احکام اسلام کے نفاذ کے لئے سیاسی تسلط وغلبہ ناگزیر ہے۔ آج بھی مسجدوں کی امامت شہادت دیتی ہے کہ عبادات کی ادائیگی کے لئے بھی ہمیں اس نظام کو قائم رکھنا ہے۔ لیکن مسجدوں کی جماعتیں کتنی بڑی ہوتی ہیں امت مسلمہ کا بہت بڑا حصہ تو مسجدوں سے باہر ہے اور سارے نظام حیات پر انہیں کا غلبہ ہے۔ یہ تو ایک مضحکہ خیز حقیقت ہے کہ اوقاف کے نظام کو آزاد منش حکام کے ہاتھوں برباد کرکے ہمیں یہ اصلاح سوجھتی ہے کہ مسجدوں کے اماموں کو موثر طور پر خطبہ دینے کی تعلیم وتربیت دی جائے۔ یہ امام کیا اور ان کے خطبوں کا اثر کیا؟ نہ منہ زور حکام مسجدوں میں آتے ہیں نہ لادین دانشوروں کو توفیق ہوتی ہے کہ ان کی باتیں سنیں، وہ تو سمجھتے ہیں کہ یہ امام وخطیب ہمارے طفیل میں امامت کرتے ہیں اور خطبہ دیتے ہیں۔ ایسے طفیلیوں کے ساتھ نہ کسی کو عقیدت ہوسکتی ہے اور نہ ان کے خطبوں سے فیض واثر کی توقع کی جاسکتی ہے۔

اندریں حالات نہ ہماری موجودہ مسجدیں ہمیں صحیح تعلیم سے آشنا کرسکتی ہیں، نہ ہماری عبادتیں بارگاہ خداوندی میں قبولیت حاصل کرسکتی ہیں، کیونکہ ہماری ایمانی کمزوری عبادتوں کو اتنی قوت نہیں عطا کرسکتی کہ بارگاہ خداوندی کا رخ کرسکیں۔ ہماری لادینی اور اشتراکی تحریکوں کا اتنا بول بالا ہے کہ ہمارے حکام آج اپنے اپنے جغرافیائی مقامات کی قدیم تہذیب وتمدن میں محو ہیں اور لاف وگزاف میں مشغول، صدیوں کی بوسیدہ اور لایعنی یادگاروں کی مدح میں رطب اللسان ہیں اور اب تو انہیں یہ بھی یاد نہیں رہا

مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا!